ڈاکٹر عبدالحمید

قائدِ اعظم — ایک عظیم رہنما

قائداعظم کو دنیا کے عظیم راہنماؤں میں بہت بلند مقام حاصل ہے۔ انھوں نے ایک ملک بنایا، ایک قوم بنائی۔ ان سے پہلے پاکستان کا وجود تھا نہ پاکستانی قوم کا۔ دوسرے لیڈروں کو بنی بنائی قومیں اور بنے بنائے ملک ملے۔ اس لحاظ سے دنیا کے بہت کم لیڈر ان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اپنے ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الٰہ آباد میں علاّمہ اقبال نے عظیم راہنماؤں کی بعض غیر معمولی صفات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ صحیح لیڈر وہ ہوتا ہے جس کو گہرا تاریخی شعور ہو، جس کو اپنی قوم کی عظمت پر کامل یقین ہو اور جو قوم کے درخشاں مستقبل پر ایمان رکھتا ہو۔ اس سے کم و بیش سات برس کے بعد علاّمہ نے خود ہی اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ قائد میں یہ تمام صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی ایک چھٹی میں قائداعظم کو لکھا تھا کہ اب برّصغیر کے مسلمانوں کی آنکھیں رہ رہ کر صرف آپ اور آپ کی طرف ہی اٹھیں گی اور آپ ہی ان کی ڈگمگاتی ہوئی کشتی کو ساحلِ مراد پر پہنچائیں گے۔ جن لوگوں نے تنظیم نو کے بعد مسلم لیگ کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ۱۹۳۶ء سے لے کر اپنے انتقال کے وقت تک علاّمہ اقبال قائداعظم کے سب سے بڑے مشیر تھے۔ اقبال نے سیاسی مسائل پر [illegible] لکھے ان کی جھلک قائداعظم کی تقریروں میں صاف صاف نظر آتی ہے۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ عظیم لیڈر خدا کی دین ہوتا ہے۔ وہ بنائے سے نہیں بنتا۔ اس کا انتظام قدرت خود کرتی ہے۔ جب وہ اپنے مشن کا آغاز کرتا ہے تو غیر یقینی فضا کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ نازک سے نازک حالات میں بھی قوم کی کشتی کو طوفان کے تھپیڑوں سے نکال لاتا ہے۔

اسلام اور مسلمانوں کی محبت قائداعظمؒ کی شخصیت کی اساس تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی پرورش ایک گہرے مذہبی ماحول میں ہوئی تھی۔ قانون کی تعلیم کے لیے جب وہ انگلستان پہنچے تو یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ کس درس گاہ میں داخلہ لیں۔ جب انھوں نے یہ دیکھا کہ لنکز اِن کے دروازے پر لکھے ہوئے دنیا کے بڑے بڑے مقنّنوں کے ناموں میں پیغمبرِ اسلام کا نام بھی شامل ہے تو وہ بلاتامّل اس مدرسے سے وابستہ ہو گئے۔

۱۹۱۰ء میں وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر بنے۔ وہاں ان کا اوّلین کارنامہ یہ تھا کہ وہاں انھوں نے پریوی کونسل کے ایک فیصلے سے پیدا ہونے والی ناموافق صورتِ حال کی اصلاح کے لیے وقف علی الاولاد کے قانون کے استقرار کے لیے ایک بل پیش کیا۔ اس بل پر انھوں نے جو تقریر کی، اس کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی شرع سے وہ کما حقہٗ واقفیت رکھتے تھے۔ اس قانون کے پاس ہونے کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں کھاتے پیتے مسلمان گھرانے تباہی سے بچ گئے۔

۱۹۱۳ء میں وہ ایک کام کے سلسلے میں انگلستان گئے ہوئے تھے کہ مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن نے ان کو مسلم لیگ میں شمولیت کی دعوت دی۔ اس موقع پر ان حضرات سے جو گفتگو ہوئی اسے عام طور پر مسز سروجنی نائیڈو کی شاعرانہ اور رنگین زبان میں بیان کیا جاتا ہے، جس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ وہ بادلِ نخواستہ لیگ میں شامل ہوئے تھے۔ بات یوں نہ تھی۔ اپنے سیاسی عقائد کے باوجود ان کو اپنی قوم کی محبت ہی لیگ میں کھینچ لائی تھی۔ برصغیر کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر ۱۹۳۲ء میں انھوں نے انگلستان میں سکونت اختیار کر لی اور عملاً سیاست سے ریٹائر ہو گئے۔ لیکن جب مسلمانوں کی بدحالی اور قوم کے انتشار کی خبریں متواتر ان تک پہنچنے لگیں تو انھوں نے واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت ان کا ایک انگریز دوست آیا اور اس نے ان کے فرنیچر اور دوسرا قیمتی گھریلو سامان خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ قائداعظم نے اس کا جو جواب دیا وہ قابلِ غور ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ آپ ان سب چیزوں کو سمیٹ لیں۔ میرے نزدیک اب یہ بالکل بے حیثیت ہیں۔ میری نظروں میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ واپسی کے بعد اپنے بڑھاپے کے باوجود انھوں نے ایک عدیم المثال عوامی تحریک کی راہنمائی کا بوجھ تن تنہا اپنے کندھوں پر اٹھایا، اس لیے کہ ان کو اپنی قوم سے عشق تھا اور وہ اپنی قوم کے مستقبل کے متعلق پُر اعتماد تھے۔ انھوں نے جب اس کٹھن وادی میں قدم رکھا ان کی زندگی کے طور طریقے بالکل بدل گئے۔ سالوں کی جاں گداز محنت سے وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے۔ ایک نئی اسلامی سلطنت کے بانی اور سالارِ اوّل بنے۔ ذاتی منفعت کا خیال ان کے نزدیک پھٹکتا تک نہ تھا۔ ان کو تمام دنیاوی آسائشیں میسّر تھیں، اگر وہ چاہتے تو اپنی باقی ماندہ زندگی کے ایام نہایت آرام اور سکون کے ساتھ انگلستان کے خوش گوار ماحول میں گزار سکتے تھے۔

صداقت ان کی فطرت کا ایک خاص جوہر تھا۔ آج کل کی سیاست بہت حد تک غیر اخلاقی سیاست بن گئی ہے۔ اس میں بہت سی ضد سیاستیں روا رکھی جاتی ہیں۔ کامیاب سیاست دان وہی سمجھا جاتا ہے

جو اقبال کے کہنے کے مطابق "قول باطل" کے لیے "حجت استوار" فراہم کرسکتا ہو۔ قائداعظم نے سیاست کی منجدھار میں ہوتے ہوئے بھی کبھی اپنے دامن کو غلط بیانی سے آلودہ نہ ہونے دیا۔ وہ کم بولتے تھے، جب بولتے تو جچی تلی اور مدلل بات کرتے۔ سننے والوں کے جذبات کو ابھارنے کے فن سے ناآشنا تھے۔ کسی شخص کو اپنے قول یا فعل سے غلط فہمی میں مبتلا کرنا ان کے اصول کے خلاف تھا۔ وہ دوست کو دھوکا دیتے تھے نہ دشمن کو۔ وہ اپنے مفہوم کو ایسے الفاظ کا جامہ پہناتے تھے کہ ان کی کہی ہوئی بات ہمیشہ شک و شبہ سے بالا ہوتی تھی۔ وائسرائے ہند لارڈ ویول نے اپنی ڈائری میں عالمی شہرت کے ایک راہنما کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ لیڈر موصوف جس کی قوم اس کی پوجا کرتی تھی، میرے پاس آیا اور آدھ گھنٹہ گفتگو کرتا رہا۔ دھیمے دھیمے لہجے میں وہ آہستہ آہستہ بولتا تھا، اس کی گفتگو کو سمجھنے کے لیے بھرپور توجہ کی ضرورت تھی لیکن بات یوں ہے کہ اس کے ہر فقرے سے کم از کم دو معنے اخذ کیے جا سکتے تھے۔ قائداعظم کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔ وہ کسی شخص کو بھی الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنسا کر پریشان کرنا نہ جانتے تھے۔ ساری عمر ہمیشہ سیدھی بات کو سادہ ترین الفاظ میں بیان کرتے۔ یہ ایک غیر معمولی ملکہ ہے۔ ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

دلیری اور جرأت بھی راہنمائی کے خاص اوصاف ہیں۔ غلامی کے دور میں یہ جنس قریباً قریباً نایاب تھی۔ یوں بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ غلام قوموں میں ایک قسم کی روباہ مزاجی راسخ ہو جاتی ہے، جو بہت سی اعلیٰ انسانی صفات کو لے ڈوبتی ہے۔ روبہی روشن دماغی سے مکر و دجل اور جبن پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن غلامی کے اس تاریک دور میں بھی قائداعظم اپنے موقف پر چٹان کی طرح ڈٹے رہتے تھے۔ وہ دوسروں کے الفاظ میں اپنے معنی نہ ڈالتے تھے۔ جو کہتے تھے وہ کر دکھاتے تھے۔ ۱۸-۱۹۱۹ء کے پُرآشوب زمانے میں جب فتح کے نشے میں چور برطانوی حکومت کے مقامی کارندے اس محکوم ملک میں آزادی کی سب روایتوں کو ملیامیٹ کرنے پر تلے بیٹھے تھے، انھوں نے بمبئی کے سبکدوش ہونے والے گورنر ولنگڈن کی الوداعی تقریب کے انعقاد کی کھلم کھلا مخالفت کی اور اس کو ناکام بنا دیا۔ یاد رہے کہ ان دنوں صوبائی گورنر تو ایک طرف بڑے بڑے لیڈر بہت ادنیٰ درجے کے حاکموں کی ناراضگی مول لینے سے بھی گریز کرتے تھے۔ وہ کم و بیش ۳۷ سال تک مرکزی اسمبلی کے ممبر رہے۔ زیر بحث آنے والے مسئلوں پر انھوں نے جس صاف گوئی سے اپنا موقف پیش کیا اس کی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ اپنی صداقت کی وجہ سے وہ انگریز حاکموں کے پہلو میں

ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہے۔ چونکہ وہ آئین اور قانون کی حدود کا احترام کرتے تھے اس لیے دفتری حکومت کا کوئی صاحب اقتدار رکن ان پر انگشت نمائی نہ کر سکتا تھا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ برطانوی ہند کے آخری چار وائسراؤں یعنی ولنگڈن، لنلتھگو، ویول اور ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ ان کے شدید اختلافات رہا کرتے تھے لیکن وہ اپنے مسلک پر قائم رہتے تھے اور کسی مخالفت اور مزاحمت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

انگلستان میں منعقد ہونے والی گول میز کانفرنس کے موقع پر انھوں نے جو تقریریں کیں، ان کو پڑھنے سے ان کے سیاسی مسلک کا آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں تین اہم مسائل کا ذکر بے موقع نہ ہوگا۔

۱۔ مدت العمر سے برطانوی ہند میں ایک ایسا قانون رائج تھا جس کی رُو سے حکمران قوم کے ان افراد کو جو ملکی عدالتوں میں مجرموں کے کٹہرے میں لائے جاتے تھے، بہت سی قانونی رعایتیں حاصل تھیں۔ ایسے مقدموں میں قانون کا نفاذ اس طرح ہوتا تھا کہ قتلِ عمد کے ثابت ہونے پر بھی مجرم یا تو صاف بَری ہو جاتا تھا یا ایک مختصر مدت کی قیدِ محض یا معمولی سا جرمانہ ادا کرنے سے اس کی خلاصی ہو جاتی تھی۔ اس مجرمانہ نسلی امتیاز کے خلاف اہلِ ملک کو عرصے سے شکایت تھی۔ جب گول میز کانفرنس میں یہ سوال زیرِ بحث آیا تو ۸۹ ڈیلی گیٹوں میں قائداعظم ہی وہ اکیلے مندوب تھے جنھوں نے برطانوی حکومت کے منشا کے خلاف مروّجہ قانون کی جان توڑ مخالفت کی۔ باقی تمام کے تمام ڈیلی گیٹ جن میں بڑے بڑے نامی گرامی قوم پرست اور آزاد خیال لوگ شامل تھے، خاموش رہے۔ ظاہر ہے کہ اس تن تنہا جنگ میں قائداعظم کو زک پہنچی۔ لیکن یہ ہزیمت دراصل ان کی زبردست اخلاقی فتح تھی۔

۲۔ گول میز کانفرنس کی ایک ذیلی کمیٹی ملکی ڈیفنس سے متعلق سوالوں پر غور کرنے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ عرصہ سے یہ مطالبہ زور پکڑ رہا تھا کہ اہلِ ملک کے لیے فوج کے اعلیٰ عہدوں میں گنجائش پیدا کی جائے۔ لیکن یہاں یہ حال تھا کہ برطانوی ہند کی فوج کے تین ہزار اعلیٰ عہدے داروں میں صرف اسّی کے قریب ملکی تھے اور ان میں دس افسروں کا سالانہ اضافہ ممکن تھا۔ اس رفتار سے فوج کو قومیانے کے لیے کم از کم پونے دو سو سال کا عرصہ درکار تھا۔ قائداعظم اس سوال پر پہلے بھی کئی مرتبہ حکومت کی پالیسی پر کڑی نکتہ چینی کر چکے تھے، لیکن گول میز کانفرنس میں انھوں نے پورے زور کے ساتھ یہ مطالبہ پیش کیا کہ انگریزی عناصر کی بھرتی یک قلم موقوف کر دی جائے اور ہندوستانی افواج میں کمشنڈ افسروں کے عہدے صرف ہندوستانیوں کے لیے مخصوص کر دیے جائیں۔ اس بات پر تعجب ہوتا ہے کہ اس معقول مطالبے کی تائید میں ایک ہندوستانی

ڈیلی گیٹ کی بھی آواز نہ اٹھی۔ ان میں سے کوئی بھی برطانوی حکومت کو ناراض کرکے اپنے مفاد کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

۳۔ اسی طرح برطانوی قوم کے ان تاجروں کو جو برِصغیر کے مختلف حصوں میں کئی سالوں سے کاروبار کر رہے تھے غیر معمولی رعایتیں حاصل تھیں، جن سے ملک کی تجارتی شہ رگ پر ان کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ برطانوی حکومت ان مراعات کو جوں کا توں قائم رکھنا چاہتی تھی، لیکن قائداعظم نے اس اقدام کی پُرجوش مخالفت کی۔ ان کی حد سے بڑھی ہوئی مخالفت سے پریشان ہوکر برطانوی وزیراعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ نے ان کو اپنے پاس بلایا، چکنی چپڑی باتیں کیں اور ان کو کئی قسم کی پیش کش کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ جادو نہ چل سکا اور برطانوی حکومت کے سربراہ کو منہ کی کھانا پڑی۔

۱۹۴۷ء کے حالات بہت سنگین تھے۔ ماؤنٹ بیٹن جو مارچ کے آخر میں وائسرائے بن کر آیا، وہ تقسیم ملک کا شدید مخالف تھا۔ برطانوی حکومت اس کی پشت پر تھی۔ گاندھی ہمیت کانگریس کے رہنما کئی سال سے اندرون ملک اور بیرونی دنیا میں قیام پاکستان کے خلاف سازشوں کا جال بچھا چکے تھے۔ برطانوی سلطنت اتنی وسیع تھی کہ اس پر کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا۔ ہندوؤں کی آبادی ملک کے اندر تین چوتھائی کے قریب تھی۔ اس متحدہ محاذ کو شکست دے کر تقسیم ملک کا اصول بدترین مخالفوں سے منظور کروانے کے لیے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی اور یہ عظیم مہم قائداعظم کی جرأت اور فراست سے سر ہوئی۔ تمام پاکستانی اور غیر پاکستانی مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ اگر قائداعظم کی شخصیت درمیان میں نہ ہوتی تو قیام پاکستان کا مسئلہ کئی سال الجھا رہتا۔

اسی طرح جب ماؤنٹ بیٹن حصولِ آزادی کے بعد پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کا مشترکہ گورنر جنرل بننا چاہتا تھا، قائداعظم نے محض ایک اصول کی بنا پر اس کے خواب کو شرمندۂ تعبیر نہ ہونے دیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے ڈورے ڈالے، لالچ دیئے، دھمکیاں دیں لیکن وہ قائداعظم کو اپنے ارادے سے متزلزل نہ کر سکا۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ ایک غیر مسلم کو اسلامی مملکت کا سربراہ بنانے سے اسلامی مملکت کا تصور ساقط ہو جائے گا۔

قائداعظم کی سیرت کا ایک اور نمایاں پہلو ان کی دیانت اور بے نفسی تھی۔ جن لوگوں کو ذاتی طور پر ان تک رسائی تھی یا جنھوں نے ان کے ساتھ مل کر کام کیا تھا، ان کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ ان کا

عزم چٹان کی طرح مضبوط تھا اور ان کو کوئی شخص کسی قیمت پر بھی نہیں خرید سکتا تھا۔ غیر ملکی حکومت کے ماتحت کوئی عہدہ اور بڑے سے بڑا خطاب ان کی دسترس سے باہر نہ تھا۔ وہ چاہتے تو کانگریس کی صدارت حاصل کر سکتے تھے۔ متحدہ ہندوستان میں وزیر اعظم کا عہدہ ان کے سامنے پلیٹ میں رکھ کر پیش کیا گیا۔ لیکن انھوں نے ہر پیش کش کو ٹھکرا دیا۔ ایک عدیم النظیر سیاسی اور دستوری جنگ کی راہنمائی کی۔ اپنے آپ کو کڑی سے کڑی آزمائشوں میں ڈالا لیکن ان کے پائے ثبات میں کبھی لغزش نہ آئی۔ ان کی زبان سے کبھی مایوسی کا ایک لفظ یا ایک کلمہ بھی نہ نکلا۔ یہی نہیں بلکہ ان کی لاتعداد چھپی ہوئی تقریروں کو پڑھیے، پڑھنے والے کے دل میں عزم پیدا ہوتا ہے۔ اس کا حوصلہ بڑھتا ہے۔ اس کی قوت عمل بیدار ہوتی ہے۔ ان کی تقریروں کے ٹیپ ریکارڈ سنیے، ان کی آواز کی کڑک سے ان کی پُر عظمت شخصیت اور ان کے بلند ارادوں کا اندازہ ہوتا ہے۔

یادگارِ شبلی

از ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

اس کتاب میں شبلی نعمانی کے مفصل حالاتِ زندگی اور ان کی تصانیف اور کارناموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے ——— شمس العلما علامہ شبلی نعمانی کو ہمارے ادب اور تاریخ میں جو بلند مقام حاصل ہے وہ محتاجِ بیان نہیں۔ ان کے احوالِ زندگی سید سلیمان ندوی مرحوم نے حیاتِ شبلی میں جمع کیے تھے۔ ڈاکٹر اکرام صاحب کی اس کتاب "یادگارِ شبلی" میں نہ صرف مکمل حیاتِ زندگی ہی بلکہ اس میں وہ مواد بھی سمیٹ لیا گیا ہے جو سید سلیمان ندوی کی تصنیف "حیاتِ شبلی" کی اشاعت کے بعد دستیاب ہوا۔ مزید برآں علامہ شبلی کی ایک ایک کتاب پر علیحدہ تفصیلی تبصرہ بھی ہے۔

قیمت : ۱۷ روپے

ملنے کا پتہ : ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور